فلسفۂ بیخودی

رموزِ بیخودی کے تناظر میں مطالعہ

پروفیسر رشید احمد صدیقی

ہر چیز ایک نظام کے ماتحت ہوتی ہے۔ ہماری زندگی فی الحقیقت علائق اور نسبتوں کی ایک نامتناہی زنجیر ہے۔ جز و کل کا ربط ناگزیر ہے۔ وہ ہر چیز جسے ہم انسانی زندگی سے تعبیر کرتے ہیں۔ تعینات مخصوصہ کا نام ہے اور تعین کا وجود تسلسل سے ہے افراد کا جماعت سے تعلق ہوتا ہے، جز کی بحث ہو چکی۔ اب کل کے ساتھ اس کی نسبتوں پر نظر ڈالنی لازم آتی ہے، اقبال نے اس کا اعادہ ان الفاظ میں کیا ہے:

فرد و قوم آئینہ یک دیگراند
سلک و گوہر کہکشاں و اختراند

فرد می گیرد ز ملت احترام
ملت از افراد می یابد نظام

فرد تا اندر جماعت گم شود
قطرۂ وسعت طلب قلزم شود

فرد تنہا از مقاصد غافل ست
قوتش آشفتگی را مائل ست

ملت کا قیام اختلاط افراد پر ہے اور اس کی تعمیر و تکمیل نبوت سے ہوتی ہے، جماعت کا حقیقی مفہوم نفس نبوت کا ترجمان ہے ہر شے خواہ وہ افراد سے متعلق ہو یا جماعت سے جب تک کوئی زندہ عقیدہ یا قانون اسے مربوط یا مستحکم نہ کرے، ربط کا کوئی حقیقی مفہوم پیدا نہیں ہوتا:

تا خدا صاحب دلے پیدا کند

کو ز حرفے دفترے املا کند
ساز پردازے کہ از آوازۂ
خاک را بخشد حیاتِ تازۂ

زندہ از یک دم دو صد پیکر کند
محفلے رنگیں ز یک ساغر کند

بندہا از پا کشاید بندہ را
از خداونداں رہاید بندہ را

گویدش تو بندۂ دیگر نۂ
زیں بتان بے زباں کمتر نۂ

تا سوے یک مدعایش می کشد
حلقہ آئیں بپایش می کشد

ایک اسلامی شاعر ہونے کی حیثیت سے اقبال کے نزدیک اس عالم کی حقیقی نجات بہ الفاظ دیگر معاشرت کے تمام شعبہ جات کی کامیابی و کامرانی اسلامی اصول کی پابندی اوران کے نفاذ سے وابستہ ہے۔ شاعری کا براہ راست کام یہ ہے کہ وہ جذبات کو متاثر کرے اور ایک مذہب پرست کا شیوۂ مذہبی عقائد کی ترویج وتلقین ہے وہ بھی اس طور پر کہ وہ اپنے عقائد کو محض عقائد کی حیثیت سے تسلیم کرائے۔ان نظریات کو ملحوظ رکھ کر اقبال کی شاعری پر نظر ڈالی جائے تو یہ حقیقت محسوس ہوتی ہے کہ وہ باوجود شاعر اور مذہب پرست ہونے کے، انسانی ذہن وفکر کے میلانات طبعی کو کبھی نظر انداز نہیں کرتے۔ وہ ارکان اسلامی کی صداقت اور ہمہ گیری پر زور دیتے ہیں اس لیے نہیں کہ وہ خود مسلمان ہیں بلکہ محض اس بنا پر کہ انسانی ذہن وفکر کا اسلام سے انحراف کرنا ناممکنات سے ہے، اور یہی وجہ ہے کہ اپنے شعر و شاعری میں الفاظ اور ترکیبیں تو ضرور شاعرانہ رکھتے ہیں لیکن بحث واستدلال ایک فاضل حکیم کے انداز سے کرتے ہیں۔اسلام کے ارکان اساسی میں توحید، رسالت، نماز، روزہ، حج وزکوٰۃ کو مخصوص حیثیت حاصل ہے، آخرالذکر چار فرائض ایسے ہیں جو عمل سے متعلق ہیں، اقبال نے ان کے فلسفہ پر خیالات ظاہر کیے ہیں لیکن پہلے دو حقیقتوں یعنی توحید اور رسالت پر رموز بے خودی میں نہایت شرح وبسط سے بحث کی ہے، توحید اور رسالت کا تعلق چونکہ معتقدات سے ہے اور یہیں سے دوسرے شعبہ جات کی ابتداء ہوتی ہے۔ اس لیے اقبال نے ان پر خصوصیت کے

ساتھ بحث کی ہے، کیونکہ توحید اور رسالت کو دیگر ارکان اسلامی سے وہی تعلق ہے جو بقیہ دفعات قانونی کو تمہید یا ''پری ایمبل'' سے ہوتی ہے فرماتے ہیں:

اہل حق را رمز توحید ازبر است
در اتیِ الرّحمٰن عبداً مضمر ست

دیں از و، حکمت ازو، آئیں ازو
زور ازو، قوت ازو، تمکیں ازو

اسود از توحید احمر می شود
خویش فاروقؓ و ابوذرؓ می شود

ملت از یک رنگیِ دلہاستی
روشن از جلوۂ ایں سیناستی

قوم را اندیشہا باید یکے
در ضمیرش مدعا باید یکے

جذبہ باید در سرشتِ او یکے
ہم عیار خوب و زشتِ او یکے

گر نباشد سوز حق درساز فکر
نیست ممکن ایں چنیں انداز فکر

مدعاے ما، مآل ما یکے ست
طرز و انداز خیال ما یکے ست

توحید ہی وہ حقیقت ہے جو انسان کو ان مکروہات سے محفوظ و مصئون رکھتی ہے جن میں اسیر ہو کر وہ زندگی کو پرآشوب تصور کرنے لگتا ہے۔ مایوس، محزوں یا مخوف ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ یا تو انسان کو اپنے اوپر اعتماد نہیں ہے یا پھر وہ کسی ایسے حکیم و قادر کا قائل نہیں ہے جو نہ کبھی غلطی کرتا ہے اور نہ کبھی ظلم گوارا رکھتا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو یہ حقیقت بھی ظاہر ہو جائے گی کہ خود اعتمادی کا اصلی راز بھی اسی عقیدۂ توحید میں مضمر ہے، ہم کو اپنے اوپر اس لیے اعتماد نہیں ہے کہ ہماری قوت و حکومت کے ذرائع و وسائل نامحدود ہیں

بلکہ اس کا باعث صرف یہ ہے کہ جہاں سے ہم قوت وقدرت حاصل کرتے ہیں وہ ایک ایسی ہستی اور حقیقت ہے جو کبھی غلطی یا زیادتی نہیں کرتی۔ اس لیے جب تک ہم اس حقیقت یا ہستی کی پیروی کریں گے ناکامیاب نہیں رہ سکتے۔ اقبال نے اس کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

مرگ را ساماں ز قطع آرزو ست
زندگانی محکم از لاتقنطُوا ست

اے کہ در زندان غم باشی اسیر
از نبی تعلیم لاتحزن بگیر

چوں کلیمے سوے فرعونے رَود
قلب او از لاتخف محکم شود

بیم غیراللہ عمل را دشمن ست
کاروانِ زندگی را رہزن ست

بیم چوں بندست اندر پاے ما
ورنہ صد سیل ست در دریاے ما

ہر شر پنہاں کہ اندر قلب تست
اصل او بیم ست اگر بینی درست

لابہ و مکاری و کین و دروغ
ایں ہمہ از خوف میگیرد فروغ

ہر کہ رمز مصطفیٰ فہمیدہ است
شرک را در خوف مضمر دیدہ است

اسلام سے پہلے، انسانی ذہن وفکر کو وہ آزادی حاصل نہ تھی جسے آج ہم علم وتہذیب کا طرۂ امتیاز سمجھتے ہیں، انسان موجودات فطرت کی پرستش کرتا تھا اس لیے وہ کبھی اس پر جری نہ ہوسکا کہ ان کو اپنا تابع اور مسخّر بنائے چاند، سورج، برق و باراں، پہاڑ، دریائیں غرض کہ اس قسم کی تمام چیزیں اس کے نزدیک معبود کی حیثیت رکھتی تھیں۔ پھر یہ کس طرح ممکن تھا کہ وہ ان کا کسی طور پر تجزیہ کرتا یا ان پر قدرت حاصل کرنے کی

جرات کرتا اس سے ترقی کر کے انسان نے انسان کی پرستش شروع کی، اس کی مختلف صورتیں تھیں، کبھی اس نے اپنی ہی نوع کو مذہبی حیثیت سے قادرِ مطلق گردانا اور کبھی کسی جابر قہرمان کے آگے جھکا، اس کا ایک نہایت دل نشین خاکہ رموزِ بےخودی میں اقبال نے یوں پیش کیا ہے:

بود انساں در جہاں انساں پرست
ناکس و نابودمند و زیر دست

سطوت کسریٰ و قیصر رہزنش
بند ہا در دست و پا و گردنش

کاہن و پاپا و سلطان و امیر
بہر یک نخچیر صد نخچیر گیر

صاحب اورنگ و ہم پیر کنشت
باج برکشت خراب او نوشت

در کلیسا اسقف رضواں فروش
بہر ایں صید زبوں دامے بدوش

برہمن گل از خیابانش ببرد
خرمنش مغ زادہ با آتش سپرد

از غلامی فطرت او دوں شدہ
نغمہ ہا اندر نئے او خوں شدہ

ایک دوسرے مقام پر اس کا اعادہ یوں کیا ہے:

فکر انساں بت پرستے بتگرے
ہر زماں در جستجوے پیکرے

باز طرح آزری انداخت ست
تازہ تر پروردگارے ساخت ست

کاید از خوں ریختن اندر طرب

نام او رنگ ست و ہم ملک و نسب

اگر غور کیا جائے تو اسلام نے سب سے بڑی نعمت جو دنیا کو تفویض کی وہ یہ ہے کہ ہر انسان علم وعمل کے لیے آزاد ہے اس طور پر بقول اقبال اسلام کو ایک وسیع علمی تحریک قرار دینا چاہیے۔ یہ ایک حقیقت تھی جس کو اسلام سے قبل طرح طرح سے مستور رکھا گیا۔ اسلام چونکہ دین فطرت ہے اس لیے اس نے اس حقیقت کو فطری ہی طور پر برافگندہ نقاب بھی کیا، اس نے محض ایک مقولہ نہیں پیش کیا بلکہ ساتھ ہی ساتھ نمونہ بھی دنیا کے سامنے لا کھڑا کیا اور وہ بھی اس سہل اور سادہ انداز سے کہ معمولی سے معمولی عقل وتمیز بھی اس سے پوری طور پر آشنا ہو سکی۔ اسلام کے خدا نے اسلام کا محض اپنے کلام والہام سے اعلان نہیں کیا بلکہ اس کو جناب رسالت مآبؐ کی ذات میں ثابت بھی کر دیا۔ رسالت مآبؐ کے وجود وحیات سے نہ صرف یہ حقیقت واضح ہوئی کہ خدا کیا ہے بلکہ انسان کو کیا کرنا ہے اور جو کچھ کرنا ہے وہ کر بھی سکتا ہے، نظر برآں رسالت مآبؐ کی زندگی کو خدا سے وہی نسبت حاصل ہے جو انسانوں کو رسالت مآب سے حاصل ہے۔ اس لیے جہاں تک علم وعمل کا دخل ہے رسالت مآب کی زندگی ہم انسانوں کے لیے خدا کی ذات وصفات سے زیادہ قریب، زیادہ قابل تقلید اور زیادہ ممکن العمل ہے ممکن ہے اسی عقیدے کا اظہار اقبال نے ان الفاظ میں کیا ہو:

معنی حرفم کنی تحقیق اگر
بنگری با دیدۂ صدیقؓ اگر

قوت قلب و جگر گردد نبی
از خدا محبوب تر گردد نبی

رسالت مآبؐ نے دنیا کے سامنے جو دستور العمل اپنے نمونہء زندگی سے پیش کیا ہے اس پر غور کرنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ''حریت'' ''مساوات'' و''اخوت بنی نوع انسان'' کی بنیاد اس کا نمونہ اور اس کا مقصود ''رسالت محمدیہ'' تھی، عالم انسان کی نجات ان ہی ہر سہ حقیقتوں کی تشکیل وتعمیم میں مضمر ہے۔ حریت نے ہر انسان کو انفرادی طور پر آزاد کیا، مساوات نے ان سب کو باعتبار فطرت ایک سطح پر لا کھڑا کیا اور پھر ان دونوں کو جس نے دنیا کے لیے باعث رحمت وعافیت بنایا وہ ''اخوت بنی نوع انسان'' تھی۔ اسلام کے اصطلاحی اور محدود مفہوم سے قطع نظر کر لیا جائے تو اس کے تسلیم کرنے میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ ان صفات کے اعتبار سے اسلام زمان ومکان دونوں کی قید سے آزاد ہے۔ ممکن ہے یہی سبب ہو جس کی بنا پر اقبال کی زبان پر آیا ہو۔

پس خدا برما شریعت ختم کرد

بر رسول ما رسالت ختم کرد
رونق از ما محفل ایام را
او رسل را ختم و ما اقوام را

خدمت ساقی گری باما گذاشت
داد مارا آخریں جامے کہ داشت

حریت مساوات اور اخوت کی بنا پر قومیت کا جغرافیائی مفہوم بالکل بے معنی ہو جاتا ہے۔''پین اسلامزم'' کا رمز ملک گیری میں نہیں بلکہ ''اخوت بنی نوع انسان'' میں مضمر ہے، ترکوں کا جدید رویہ جس کی بنا پر انھوں نے جمہوریہ ترکی کو ''وطنیت ترکیہ'' پر قائم کیا ہے اس بناء پر صحیح نہیں ہے کہ انھوں نے ترک یا ترکی اور اسلام کو دو مختلف حیثیتیں دے دی ہیں۔عزل خلافت سے انھوں نے اسلام کے مفہوم کو بھی مسخ کر دیا ہے۔خلافت کا کام یہ نہ تھا کہ اسلام کے دینی اقتدا کو دنیوی طاقت سے برقرار رکھا جائے بلکہ اس کا اصلی مقصد یہ تھا کہ دنیوی اقتدار کو ان پابندیوں سے بے نیاز نہ ہونے دیا جائے جن سے آزاد ہو کر حکومت اور اس کی نعمتیں محض ایک ہی قوم اور ایک ہی خطہ تک محدود نہیں رہ جاتیں بلکہ دوسری اقوام اور دوسرے ممالک کے لیے موجب آزار ہوتی ہیں۔حکومت ترکی نے وطنیت ترکیہ کے قائم کرنے میں یوں غلطی کی ہے کہ اس نے نہ صرف اسلام کی ہمہ گیری اور اس کے فیض عام کو ترکی تک محدود کر دیا اور شاید یہ بھی متیقن نہیں ہے۔ بلکہ ایک طور پر اس نے دوسرے اقوام کو بھی اسلام کی خوبیوں سے بے خبر رکھنے کا ارادہ کر لیا ہے۔اسلام صرف مسلمانوں کے لیے نہیں آیا بلکہ یہ دوسرے اقوام اور دوسرے ممالک کے لیے بھی ایک پیام عمل و عافیت ہے، اسلام صرف اسلامیوں کے لیے نہیں بلکہ بنی نوع انسان کے لیے ایک عام تبلیغ عمل ہے جس کو کسی صورت میں محدود نہیں کرنا چاہیے۔ملت اسلامیہ زمان و مکان دونوں قیود سے آزاد ہے اور یہی سبب ہے کہ اسلام میں نسل و ملک کا کوئی مفہوم نہیں:

جوہر ما با مقامے بستہ نیست
بادۂ تندش بجامے بستہ نیست

ہندی و چینی سفال جام ماست
رومی و شامی گلِ اندام ماست

قلب ما از ہند و روم و شام نیست

مرز بوم او بجز اسلام نیست

مسلم استی دل بہ اقلیمے مبند
گم مشو اندر جہان چون و چند

می نگنجد مسلم اندر مرز بوم
در دل او یاوہ گردد شام و ردم

عقدۂ قومیت مسلم کشود
از وطن آقاے ما ہجرت نمود

حکمتش یک ملت گیتی نورد
بر اساسِ کلمہ تعمیر کرد

ہجرت آئین حیات مسلم ست
ایں ز اسباب ثبات مسلم ست

صورت ماہی بہ بحر آباد شو
یعنی از قید مقام آزاد شو

آں چناں قطع اخوت کردہ اند
بروطن تعمیر ملت کردہ اند

تا وطن را شمع محفل ساختند
نوع انساں را قبائل ساختند

مردمی اندر جہاں افسانہ شد
آدمی از آدمی بیگانہ شد

روح از تن رفت و ہفت اندام ماند
آدمیت گم شد و اقوام ماند

تا سیاست مسندِ مذہب گرفت
ایں شجر در گلشن مغرب گرفت
قصہ دین مسیحائی فسرد
شعلہ شمع کلیسائی فسرد

بادہ ہا خوردند و صہبا باقی است
دوشہا خوں گشت و فردا باقی است

در سفر یار است و صحبت قائم است
فرد رہ گیر است و ملت قائم است

فرد بر می خیزد از مشت گلے
قوم زاید ازدلِ صاحبدلے

گرچہ ملت ہم بمیرد مثل فرد
از اجل فرماں پذیرد مثل فرد

امت مسلم ز آیات خدا ست
اصلش از ہنگامہ قَالُوا بَلٰی ست

از اجل ایں قوم بے پروا ستے
استوار از نَحنُ نَزَّلنَا ستے

سطوت مسلم بخاک و خوں تپید
دید بغداد آنچہ روما ہم ندید

تو مگر از چرخ کج رفتار پرس
زاں تو آئین کہن پندار پرس

آتش تاتاریاں گلزار کیست؟
شعلہ ہاے او گلِ دستار کیست؟

رومیاں را گرم بازاری نماند
آں جہانگیری جہانداری نماند
شیشہ ساسانیاں درخوں نشست
رونق خمخانہ یوناں شکست

مصر ہم در امتحاں ناکام ماند
استخوان او تہ اہرام ماند

درجہاں بانگ اذاں بودست و ہست
ملت اسلامیاں بود ست و ہست

ملت کی بنیاد اختلاط افراد پر ہے لیکن خود ملت کی شیرازہ بندی کے لیے بھی کسی آئین یا دستور کا وجود لازمی ہے۔ ایک ایسی ملت کے لیے جو تمام عالم کے لیے ابدالآباد تک ایک زندہ حقیقت کا درجہ رکھتی ہو ضروری ہے کہ اس کا آئین بھی اتنا ہی ہمہ گیر اور لازوال ہو، جیسا کہ اس سے پہلے کہیں آ چکا ہے۔ افراد اور ملت دونوں کسی نہ کسی حد تک فنا پذیر ہیں لیکن مقصد حقیقی ان اسالیب عمل سے بلند و پائندہ تر ہوتا ہے، جس کی طرف اقبال نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

فصل گل از نسترن باقی تر ست
از گل و سرو سمن باقی تر ست

کان گوہر پروری گوہر گرے
کم نہ گرد و از شکست گوہرے

ملّتِ اسلامیہ کا آئین قرآن مبین ہے۔ اقبال نے اس خیال کو یوں ادا کیا ہے:

نغمہ از ضبطِ صدا پیدا ستی
ضبط چوں رفت از صدا غوغا ستی

در گلوے ما نفس موج ہوا ست
چوں ہوا پابند نے گردد نواست

تو ہمیں دانی کہ آئین تو چیست؟
زیر گردوں سر تمکین تو چیست؟

آں کتاب زندہ قرآن حکیم
حکمت او لایزال ست و قدیم

حرف او را ریب نے تبدیل نے
آیہ اش شرمندۂ تاویل نے

نوع انساں را پیام آخریں
حامل او رَحمة لّلعَالَمِین

آنکہ دوش کوہ بارش برنتافت
سطوتِ او زہرۂ گردوں شگافت

بنگر آں سرمایہ آمال ما
گنجد اندر سینہ اطفال ما

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

اسی سلسلے میں اقبال نے ایک نہایت نازک لیکن اتنا ہی معرکہ آرا مسئلہ بھی پیش کیا ہے جس پر اس زمانہ میں صبر و ایمانداری کے ساتھ غور کرنا اتنا ہی ممکن معلوم ہوتا ہے جتنا یہ ضروری بھی ہے، یعنی زمانہ انحطاط میں تقلید اجتہاد سے بہتر ہے۔

آج بیرونی اثرات کے سیلاب اور مذہبی ناواقفیت (جس میں علم وعمل دونوں کا فقدان ہے) نے ہر شخص کو اس پر جری کر دیا ہے کہ وہ اسلام کی تعلیم پر نظر ثانی کرے۔ کسی مسئلے پر مجتہدانہ انداز سے نظر ڈالنا قابل اعتراض نہیں ہے۔ لیکن جو لوگ آج اجتہاد کے علم بردار کہے جاتے ہیں اُن کے میلانات ذہنی یا استعداد علم وعمل کا تجزیہ کیا جائے تو حسب ذیل قوتیں برسر کار نظر آئیں گی جن کے موجود ہوتے ہوئے یہ حکم لگایا جا سکتا ہے کہ ان نام نہاد اجتہادیوں کا طرز عمل صحیح نہیں ہے:

۱۔ عام طور پر یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ موجودہ مغربی تہذیب ہر حال میں مفید اور قابل تقلید ہے۔ اس وقت زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو تہذیب یورپ کو اسلام سے ہم آہنگ کرنا چاہتے ہیں۔ بعض ایسے مسلمان مصنفین جو یورپین تہذیب اور خیالات سے باخبر کہے جا سکتے ہیں یا کہے جاتے ہیں، اپنے سامنے یہ حقیقت رکھ کر آگے بڑھتے ہیں کہ جو کچھ اس وقت یورپ میں تہذیب و تمدن کے اعتبار سے مفید اور بہتر

خیال کیا جاتا ہے وہ اسلام کی تاریخ اور تہذیب سے ہم آہنگ کیا جاسکتا ہے۔ یہ اصول غلط بھی ہے اور خطرناک بھی۔

۲۔ اکثر ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ اسلام کے بعض اصول کو کسی طور پر کمزور یا قابل اصلاح سمجھتے ہیں وہ خود اپنے علم وعمل کے اعتبار سے جامع نہیں کہے جا سکتے۔ جب تک اسلام اور مغربی اصول دونوں کا صحیح اور مکمل تجربہ نہ ہو اس وقت تک کسی قسم کی ترمیم یا تنسیخ پیش کرنا صحیح نہ ہوگا۔

۳۔ یورپ کو اس وقت ایک حکمران کی حیثیت حاصل ہے۔ اس لیے اس کو وہ سب فطری سہولتیں حاصل ہیں جو اس کے تہذیب وتمدن کو مقبول بنا سکتی ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ جہاں خالص اسلامی شریعت نافذ ہے وہاں اسلامی اصول کا نفاذ کہاں تک مفید یا مکمل ہے۔ اس سلسلہ میں ہم کو افغانستان کی مثال سامنے رکھنی پڑے گی۔ لیکن اندیشہ ہے کہ بعض حضرات ترکی کی مثال پیش کرنا زیادہ اہم سمجھیں گے۔ اب تک ترکوں یا کمالیوں کا اس بارۂ خاص میں جو رویہ رہا ہے۔ اسے ملحوظ رکھتے ہوئے بے تامل کہا جا سکتا ہے کہ ترکی سلطنت صحیح معنوں میں سلطنت اسلامیہ نہیں ہے بلکہ محض سلطنت یا ''وطنیت ترکیہ'' کی حیثیت رکھتی ہے۔ ترکی نے جو نیا ورق پلٹا ہے اس کا کچھ ہی سبب کیوں نہ ہو جن اسباب یا واقعات کی بنا پر اس نے اتنا زبردست انقلاب روا رکھا ہے وہ اسلام یا خلافت کی کوتاہیوں یا زیادتیوں کے سبب سے نہ تھا بلکہ اس کی اصلی وجہ خلفائے عثمانیہ یا دولت عثمانیہ تھی۔

۴۔ انحطاط کے زمانہ میں قوائے جسمانی و ذہنی دونوں پژمردہ ہو جاتے ہیں اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسلاف کے کارنامے اپنے نظروں میں نا قابل رسائی معلوم ہونے لگتے ہیں، انسانی فطرت دشوار پسندی اور الولوالعزمی سے فطری طور پر کنارہ کش رہنا چاہتی ہے، قوم اور افراد دونوں فاتح کی حیثیت حاصل کرنے کی بجائے فاتحین کی ہمرکابی وہمنوائی زیادہ پسند کرنے لگتے ہیں۔ اقبال نے اس حالت میں تقلید کو اجتہاد سے بہتر بتایا ہے:

عہد حاضر فتنہ ہا زیر سر است
طبع نا پروائے او آفت گر ست

بزم اقوام کہن برہم ازو
شاخسار زندگی بے نم ازو

جلوہ اش ما را زما بیگانہ کرد
ساز مارا از نوا بیگانہ کرد

از دل ما آتش دیرینہ برد
نور و نار لَا اِلٰہ از سینہ برد

راہ آبا رو کہ ایں جمعیت ست
معنی تقلید ضبط ملت ست

اجتہاد اندر زمان انحطاط
قوم را برہم ہمی پیچد بساط

ز اجتہاد عالمان کم نظر
اقتدا بر رفتگاں محفوظ تر

جس طور پر ہر عمل کا کوئی خاص مقصد ہوتا ہے خواہ یہ انفرادی ہو یا اجتماعی اسی طور پر ملت اسلامیہ محمدی کا ایک نصب العین ہے اور وہ ''حفظ و نشر توحید'' ہے۔ افراد کو جو قوت جماعت کی شکل میں نمودار کرتی ہے۔ وہ کسی مخصوص مقصد کی تبلیغ یا تشکیل ہے اگر ایسا نہ ہو تو افراد اور جماعت کبھی ایک دوسرے سے وابستہ نہ ہو سکیں اس لیے ''جمعیت'' کا مدار کسی مخصوص نصب العین کی تعمیر و تعیم پر ہے لیکن ''حقیقی جمعیت'' اسی وقت حاصل ہوسکتی ہے جب نصب العین بھی ہر طور پر مکمل و مستحسن ہو۔ اس عالم حیات کا اصلی راز تبلیغ توحید میں مضمر ہے اور چونکہ اسلام کو دین فطرت ہونے کا دعویٰ ہے اس لیے مقصد بھی اتنا ہی عالمگیر اور مقدس ہے:

ہمچو جاں مقصود پنہاں در عمل
کیف و کم ازوے پذیرد ہر عمل

گردش خونے کے در رگہاے ماست
تیز از سعیِ حصول مدعا ست

صد نیستاں کاشت تا یک نالہ رست
صد چمن خوں کرد تا یک لالہ رست

نالہ ہا درکشت جاں کاریدہ است
تا نواے یک اذاں بالیدہ است

نقطہ ادوار عالم لَا اللہ
انتہائے کار عالم لَا اللہ

زانکہ در تکبیر راز بود تست
حفظ و نشر لَا اِلٰہ مقصود تست

جلوہ در تاریکیِ ایام کن
آنچہ برتو کامل آمد عام کن

لرزم از شرم تو چوں روز شمار
پرسدت آں آبروے روزگار

حرف حق از حضرت ما بردۂ
پس چرا بادیگراں نہ سپردۂ

حیات انسانی کے تمام افعال و مشاغل باعتبار تعینات ہمیشہ متشکل ہوتے رہتے ہیں اور یہ محض اس لیے کہ مزید سعی و کوشش کے لیے ایک نمونہ سامنے ہو اور یہ معلوم ہوتا رہے کہ ہر سعی و حرکت کس طور پر اور کہاں تک بار آور ہوئے اور جو کچھ کامیابی حاصل ہوئی ہے کیا وہ اس پایہ کی ہے کہ اس کے لیے مزید کوشش کی جائے یا اس کے قائم رکھنے میں مزید تگ و دو روا رکھی جائے۔ گویا ہر مزید کوشش ابتدائی کوشش کے لیے ایک سند جواز ہے۔ اس طور پر گویا زندگی کی یہ سعی پیہم ایک مقصد و مرکز کے لیے ہے۔ حیات ملّیہ کے لیے ضروری تھا کہ کوئی ''مرکز محسوس'' ہو، ملت اسلامیہ کا مرکز ''بیت الحرام'' ہے، اقبال نے اس تفصیل و تخصیص کی طرف یوں اشارہ کیا ہے:

در گرہ چوں دانہ دارد برگ و بر
چشم برخود واکند گردد شجر

خلعتے از آب و گل پیدا کند
دست و پاو چشم و دل پیدا کند

ہمچناں آئین میلاد امم
زندگی بر مرکزے آید بہم

حلقہ را مرکز چوجاں در پیکر ست
خط او در نقطۂ او مضمر ست

قوم را ربط و نظام از مرکزے
روزگارش را دوام از مرکزے

راز دارِ راز ما بیت الحرام
سوز ما ہم ساز ما بیت الحرام

دعویِ او را دلیل استیم ما
از براہین خلیلؑ استیم ما

در جہاں مارا بلند آوازہ کرد
باحدوث ما قدم شیرازہ کرد

تو ز پیوند حریمے زندۂ
تا طواف اوکنی پائندۂ

در جہاں جان امم جمعیت است
در نگر سر حرم جمعیت است

عبرتے اے مسلم روشن ضمیر
از مآل امت موسیٰؑ بگیر

داد چوں آں قوم مرکز راز دست
رشتہ جمعیت ملت شکست

آج یورپ کی جو چیز ہم کو سب سے زیادہ قابل رشک معلوم ہوتی ہے وہ اس کے فرزندوں کی ''تسخیر قوائے نظام عالم'' ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جہاں تک قوائے نظام عالم کو مسخر کرنے کا تعلق ہے یورپ کی ترقی بہرنوع مہتم بالشان ہے۔ لیکن بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اس حقیقت سے آشنا ہیں یا آشنا ہونا پسند کرتے ہیں کہ جو ترقیاں علم وعمل کی آج نظر آرہی ہیں ان کی آج سے بہت پہلے مسلمانوں نے یورپ میں

ابتدا کی تھی۔ یورپ کو جو برکات مسلمانوں سے حاصل ہوئیں ان کے شمار کرانے کا یہ موقع نہیں ہے۔اس کا اعتراف خود اہل یورپ کر چکے ہیں مسلمان اکثر اس حقیقت پر غور نہیں کرتے کہ وہ عام عالم اسلام پر اس وقت جو انحطاط رونما پاتے ہیں وہ اسلام کے اساسی تعلیمات کے سبب سے نہیں ہے بلکہ اس کا باعث مسلمان خود ہیں۔مسلمانوں سے پہلے یہ تعلیم کسی مذہب نے نہیں دی ہے کہ یہ سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، دریائیں آبشار، برق و باد پرستش کے لیے نہیں ہیں۔ بلکہ انسان کے تابع کئے گئے ہیں اور وہ اس کے ذہن و فکر اور قوت عمل کی مختلف وسیع جولا نگاہیں ہیں۔اسلام تو ایک شریعت عمل تھا ہم نے اس کو یا تو متکلمین و معتزلہ کی ورزش دماغی سمجھ لیا یا پھر جاہل مولویوں یا واعظوں کا وسیلہ رزق۔قوائے عالم کی تسخیر ڈرائینگ روم کی لطیف معصیتوں یا تکفیر کے فتووں سے نہیں کی جا سکتی اس کے لیے ضرورت تھی محنت اور قربانی کی جس سے ہم آج بھی بہت دور ہیں۔ ہم تو دوسروں کے ثمرۂ محنت سے مستفید ہونا ہی اپنا ایک بڑا کارنامہ سمجھتے ہیں۔ ہماری بڑی غلطی یہ ہے کہ ہم اسلام کی تعلیم کو محض ''راہ نجات'' یا ''بہشتی زیور'' کی تعلیم سمجھنے لگے ہیں۔ حالانکہ قرآن پاک ایک زندہ جاوید پیغام عمل ہے جس سے منحرف رہ کر مسلمان ہی نہیں کوئی قوم دنیا میں زندہ یا کامیاب نہیں رہ سکتی۔حیات ملیہ اسلامیہ کا مقصد اسرار حیات کو اس طور پر براگندہ نقاب کرنا ہے کہ دنیا میں امن و کامرانی کے امکانات وسیع ہوتے رہیں۔اس لیے حیاتِ ملّی کے لیے لازم ہے کہ اس کا مقصد عین تسخیر قوائے نظام عالم ہو۔اقبال نے اس کی تبلیغ یوں کی ہے:

اے کہ با نادیدہ پیماں بستۂ
ہمچو سیل از قید ساحل رستۂ

چوں نہال از خاک ایں گلزار خیز
دل بغائب بند و حاضر ستیز

ماسوا از بہر تسخیر است و بس
سینہ او عرضہ تیر است و بس

ہر کہ محسوسات را تسخیر کرد
عالمے از ذرۂ تعمیر کرد

کوہ و صحرا، دشت و دریا بحر و بر
تختۂ تعلیم ارباب نظر

نائب حق در جہاں آدم شود
بر عناصر حکم او محکم شود

آنکہ بر اشیا کمند انداخت ست
مرکب از برق و حرارت ساخت ست

علم اسما اعتبار آدم است
حکمت اشیا حصار آدم است

جس طور پر افراد کے لیے استحکام خودی ضروری ہے اسی طور پر حیات ملیہ کے لیے بھی ''احساس خودی'' لازمی ہے۔ جہاں تک ان اصول و عقائد کا تعلق ہے جن کے حفظ، تعمیم و تشکیل کا وسیلہ ملت اسلامیہ ہے یہ بحث اس سے پہلے آ چکی ہے کہ ہماری حیات کا مقصد اور اس کا دار و مدار لا اِلہ پر ہے لیکن امت کو جو نسبت رسول سے حاصل ہے وہ کئی حیثیت سے اہم ہے۔

خدا نے بعثت نبوی میں سب سے بڑا راز یہ رکھا ہے کہ وہ جو کچھ ہم بندوں سے کرانا چاہتا ہے اس کا ہم بندوں ہی میں سے نمونہ بھی پیش کر دیتا ہے تا کہ ہم اس کو اپنے لیے محض ایک آسمانی کرشمہ نہ سمجھیں جو بندوں کی فہم و ادراک یا ان کے سعی عمل سے بالا ہو۔ بلکہ ایک ممکن العمل حقیقت تصور کریں۔ ٹھیک اسی طور پر ملت کی ترقی و بقا کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم محض عقائد مجردہ کی علم برداری کرتے رہیں بلکہ ان روایات کا احترام کریں اور اس کو برقرار رکھیں جو ہمارے برگزیدہ اسلاف نے اپنے عمل سے ہمارے سامنے پیش کیے ہیں اقبال نے اس کی تفصیل و توضیح ایک نوزائیدہ بچے سے کی ہے جو ابتداً ہر شے سے نا آشنا ہوتا ہے اور جس کا:

بستہ با امروز او فرداش نیست
حلقہ ہاے روز و شب در پاش نیست

چشم ہستی را مثال مردم ست
غیر را بینندہ و از خود گم ست

رفتہ رفتہ:

صد گرہ از رشتہ خود وا کند
تا سر تار خودی پیدا کند

گرم چوں افتد بکار روزگار
ایں شعور تازہ گردد پایدار

نقشہا بردار و اندازد او
سرگذشت خویش رامی سازد او

اسی طور پر:

قوم روشن از سواد سرگذشت
خود شناس آمد زیادِ سرگذشت

سرگذشت او گر از یادش رود
باز اندر نیستی گم می شود

چشم پرکارے کہ بیند رفتہ را
پیش تو باز آفریند رفتہ را

ضبط کن تاریخ را پایندہ شو
از نفسہاے رمیدہ زندہ شو

سر زند از ماضیِ تو حال تو
خیزد از حال تو استقبال تو

مشکن از خواہی حیات لازوال
رشتۂ ماضی ز استقبال و حال

موج ادراک تسلسل زندگی است
می کشاں را شور قلقل زندگی است

موجودہ زمانہ میں ہر حقیقت کی سند جواز یا عدم جواز یورپ سے حاصل کی جاتی ہے اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یورپ کے اصول یا اس کے فیصلے نقائص یا غلطیوں سے مبرا ہوتے ہیں۔ بلکہ آج وہ فاتح کی حیثیت رکھتا ہے اور اپنے حواریین کو ممتاز اور مخالفین کو سرنگوں کرنے کے قابل ہے، ہم آج یہ نہیں دیکھتے کہ ہم میں کیا خوبیاں ہیں بلکہ یورپ کے بعض صریح نقائص کو بھی چاہتے ہیں کسی طور پر مستحسن ثابت کرسکیں قطع نظر دیگر

مسائل کے جن کو معرض بحث میں لانا طوالت سے خالی نہیں ہے۔ایک مسئلہ خواتین کی تعلیم حقوق اور آزادی کا ہے، یہاں اس سے بحث نہیں کہ یورپ نے عورتوں کو کیا سمجھ یا بنا رکھا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اسلام نے عورتوں کا جو درجہ مقرر کیا ہے وہ ہماری نظروں میں کیا وقعت رکھتا ہے۔تعدادِ ازدواج، پردہ اور اس قسم کی اور چیزیں ہم روشن خیالوں کے لیے نہایت روح فرسا ہیں اور مغرب کے لیے جب ''حلف وفاداری'' اٹھاتے ہیں تو سب سے پہلے ہماری نظر عورت ہی پر پڑتی ہے اس کے بعد کوئی تعجب نہیں کہ اگر مذہب بھی زد میں آجائے۔ نام نہاد روشن خیال طبقہ کے کارناموں پر نظر ڈالی جائے یا ان کی میلانات کا تجزیہ کیا جائے تو یہ حقیقت روشن ہو جائے گی کہ ان میں سے ہر ایک کی نظر صرف دو نقائص پر پڑتی ہے، ایک مذہب دوسری عورت۔لیکن لطف، عبرت یا تعجب یہ ہے کہ یہی دو چیزیں ہیں جو مشرق بالخصوص اسلام کے امتیازات خصوصی ہیں، اسلام نے عورت (بالفاظ دیگر امومت) کو کیا درجہ دیا ہے۔اقبال کے حسب ذیل خیالات سے ظاہر ہوگا:

پوشش عریانی مرداں زن ست
حسن دل جو عشق را پیراہن ست

آنکہ نازد بر وجودش کائنات
ذکر او فرمود باطیب و صلوٰۃ

ملت از تکریم ارحام ست و بس
ورنہ کار زندگی خام ست و بس

بردمد ایں لالہ زار ممکنات
از خیابان ریاض امہات

حافظ رمز اخوت مادراں
قوت قرآن و ملت مادراں

اقبال نے نساءِ اسلام کے لیے سیدۃ النساءؓ کو ''اسوہ کاملہ'' قرار دیا ہے:

نور چشم رحمتہ للعالمین
آں امام اولین و آخریں

بانوے آں تاجدار ھل اتی

مرتضٰی مشکل کشا شیر خدا

مادر آں مرکز پر کار عشق
مادر آں کارواں سالار عشق

مزرع تسلیم را حاصل بتولؑ
مادراں را اسوۂ کامل بتولؑ

آں ادب پروردۂ صبر و رضا
آسیا گرداں و لب قرآں سرا

مثنوی کے اس حصے کو اقبال نے انتہائے جوش عقیدت سے لکھا ہے جس کے ایک ایک حرف سے والہانہ شیفتگی کا اظہار ہوتا ہے موجودہ زمانہ میں تہذیب و شائستگی کے نام سے پیکر ناموس وعفت کے ساتھ جیسا کچھ سلوک روا رکھا جا رہا ہے، اقبال نے اس کی طرف بھی اشارہ کیا ہے:

اے ردایت پردۂ ناموس ما
تاب تو سرمایہ فانوس ما

اے امین نعمت آئین حق
در نفسہائے تو سوز دین حق

دور حاضر تر فروش و پرفن ست
کاروانش نقد دیں را رہزن ست

کور و یزداں ناشناس ادراک او
ناکساں زنجیری پیچاک او

چشم او بیباک و نا پرواستے
پنجۂ مژگان او گیراستے

ہوشیار از دست برد روزگار
گیر فرزندان خود را درکنار

این چمن زاداں کہ پرنکشادہ اند
ز آشیان خویش دور افتادہ اند

فطرت تو جذبہ ہا دارد بلند
چشم ہوش از اسوۂ زہراؓ بلند

تا حسینؓ شاخ تو با آورد
موسم پیشیں بہ گلزار آورد

خاتمہ مثنوی پر اقبال نے سورۂ اخلاص (قل ھو اللّٰہ) کی تفسیر دی ہے اور اسے ''خلاصہ مطالب مثنوی'' قرار دیا ہے۔ ''ھو اللّٰہ احد'' کا پیغام حضرت صدیقؓ کے زبان مبارک سے یوں دیا ہے:

آں کہ نام تو مسلماں کردہ است
از دوئی سوے یکی آوردہ است

خویشتن را ترک و افغاں خواندۂ
واے بر تو آنچہ بودی ماندۂ

صد ملل از ملتے انگیختی
بر حصار خود شبیخوں ریختی

یک شود توحید را مشہود کن
غائبش را از عمل موجود کن

اسی طور پر دیگر آیات شریفہ کی ترجمانی کی ہے:

گر بہ اللہ الصمد دل بستۂ
از حد اسباب بیروں جستۂ
بندۂ حق بندۂ اسباب نیست
زندگانی گردش دولاب نیست

راہ دشوارست ساماں کم بگیر
در جہاں آزاد زی آزاد میر

خود بخود گردد در میخانہ باز
برتہی پیمانگان بے نیاز

فارغ از اب و ام و اعمام باش
ہمچو سلماں زادۂ اسلام باش

گر نسب را جزو ملت کردۂ
رخنہ درکار اخوت کردۂ

رشتۂ مایک تولایش بس ست
چشم مارا کیف صہبایش ست

ہر کہ پادر بند اقلیم وجدست
بے خبر از لم یلد لم یولد ست

رشتۂ با لم یکن باید قوی
تا تو در اقوام بے ہمتا شوی

آں کہ ذاتش واحد ست و لاشریک
بندہ اش ہم در نہ ساز باشریک

مومن بالاے ہر بالا ترے
غیرت او بر نتابد ہمسرے

خوار از مہجوری قرآں شدی
شکوہ سنج گردش دوراں شدی

آخر میں اقبال نے ''رحمۃ للعالمین'' کے حضور میں ''عرض حال'' کیا ہے:

اے ظہور تو شباب زندگی
جلوہ ات تعبیر خواب زندگی
در جہاں شمع حیات افروختی
بندگاں را خواجگی آموختی

مسلم از سر نبیؐ بیگانہ شد
باز ایں بیت الحرم بت خانہ شد

از منات و لات و عزّیٰ و ہبل
ہر یکے دارد دبتے اندر بغل

اے کہ از احسان تو ناکس کس ست
یک دعایت مزد گفتارم بس ست

عرض کن پیشِ خداے عزوجل
عشق من گردد ہم آغوش عمل

ہست شان رحمت گیتی نواز
آرزو دارم کہ میرم در حجاز

تا بیاساید دل بے تاب من
بستگی پیدا کند سیماب من

با فلک گویم کہ آرامم نگر
دیدۂ آغاز انجامم نگر

(آثار اقبال، مرتّبہ: غلام دستگیر، حیدر آباد دکن، ۱۹۴۴ء)